مقالات

دلائل السنن والآثار

(۴)

از جناب مولوی نجم الدین صاحب اصلاحی

تابعین کا دور صحابۂ کرام کے بعد تابعین بالاحسان ان کے علم کے وارث ہوئے اور انہوں نے دنیائے اسلام کے گوشے گوشے میں سُنّت نبوی کے علم کو پوری حفاظت کے ساتھ پھیلایا اور اس طرح منضبط کر دیا کہ اسمیں جعل سازی کرنا کوئی آسان کام نہ رہا جیسا کہ آجکل بعض ناواقف بدگمان لوگ خیال کرتے ہیں اس گروہ میں روایت حدیث کے رُکن اعظم محمد بن مُسلم معروف بہ ابن شہاب زہری ہیں سنہ ۵۰ھ میں آپ کی ولادت ہوئی حضرت عبداللہ بن عمرؓ حضرت انس بن مالکؓ ، سعید بن المسیب وغیرہ سے روایت حدیث کی۔ لیث بن سعد کا قول ہے کہ میں نے زہری سے زیادہ جامع علم کبھی نہیں دیکھا۔ قرآن، حدیث، کلام عرب اور انساب کے متعلق ان سے بہتر کوئی بیان نہیں کر سکتا تھا۔ حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے فرمایا ہے کہ زہری سے زیادہ حدیثوں کا عالم کوئی باقی نہیں رہا۔ مکحولؒ کا قول ہے "ما رایتا احدًا اعلم بسنة ماضية من الزهری"[1] امام مالک کا بیان ہے کہ "ابن شہاب مدینہ میں آئے تو ربیعہ کا ہاتھ پکڑ لیا اور دونوں دفتر میں گئے لیکن جب عصر کے وقت دفتر سے نکلے تو ابن شہاب یہ کہتے ہوئے روانہ ہوئے کہ میرے خیال میں ربیعہ کا مثل مدینہ میں کوئی نہیں۔ اور ربیعہ یہ کہتے ہوئے چلے کہ میرے نزدیک ابن شہاب علم کے جس درجہ کو پہنچ گئے ہیں اس درجہ کو کوئی نہیں پہنچا۔ آپ کی وفات سنہ ۱۲۴ھ میں ہوئی۔ آپ کے فتاویٰ کو محمد بن نوح نے جمع کیا

[1] معرفۃ علوم الحدیث

تو تین جلدیں ہوئیں۔

ابن شہاب زہری کے شاگرد پانچ طبقوں میں منقسم ہیں۔ علامہ حازمی نے ان طبقات کو غایت تحقیق اور وقت نظر سے متعین فرما کر قیامت تک کے لئے بہت سے شکوک و شبہات کو ختم کر دیا ہے۔ چنانچہ ائمہ حدیث کے مشرب و مسلک کی توضیح کرتے ہوئے رقمطراز ہیں۔

"ان میں سے ہر طبقہ اپنے سے نیچے کے طبقے پر فضیلت رکھتا ہے۔ طبقہ اول اعلیٰ درجہ کی صحت کا حامل ہے' اور یہی امام بخاریؒ کا مستند علیہ ہے۔ طبقہ ثانیہ اگرچہ پہلے طبقہ والوں کے ساتھ ثبت ثقاہت وغیرہ میں تو شرکت رکھتا ہے لیکن پہلا طبقہ حفظ' اتقان' اور زہری کی طویل صحبت سے مستفید ہونے میں طبقہ ثانیہ سے بڑھا ہوا ہے کیونکہ زہری کے ساتھ سفر اور حضر میں اس نے ملازمت اختیار کی اور ان کی حدیثوں کی بخوبی ممارست کی اور اچھی طرح جانچ پڑتال فرمائی۔ اسوجہ سے طبقہ اولیٰ کی حدیثیں زیادہ قابل وثوق ہوئیں۔ طبقہ ثانیہ نے امام زہری کی صحبت زیادہ نہیں پائی اس لیے ان کو یہ بات حاصل نہ ہوسکی نہ ان کو حدیث زہری سے چنداں ممارست ہوئی۔ یہی شرط امام مسلم کی ہے۔ بہرحال طبقہ اولیٰ کے رواۃ امام بخاری کے شرط ہیں۔ کبھی کبھار طبقہ ثانیہ کے رواۃ کی احادیث کو بھی جن پر امام کو اعتماد ہے صحیح بخاری کے اندر لاتے ہیں لیکن بالاستیعاب نہیں۔ بخلاف امام مسلم کے کہ یہ دونوں طبقوں کی احادیث کو بالاستقصاء ذکر کرتے ہیں۔ تاہم طبقہ ثانیہ و ثالثہ کے رواۃ کی حدیثیں بھی امام بخاری نے تعلیقاً ذکر کی ہیں (ثانیہ سے زیادہ' ثالثہ سے کم) طبقہ اولیٰ میں امام مالکؒ سفیان ابن عیینہؒ' عبیداللہ بن عمرؒ' یونس بن یزید' عقیل بن خالد' شعیب بن ابی حمزہ وغیرہ حضرات شامل ہیں اور طبقہ ثانیہ میں امام اوزاعی' لیث بن سعد' نعمان بن راشد' عبدالرحمن بن خالد بن مسافر' ابن ابی ذئب وغیرہ

یہ ان رواۃ کی حالت ہے جو کثیر الحدیث ہیں۔ رہے وہ رواۃ جو قلیل الحدیث ہیں تو ان سے امام بخاریؒ کبھی کسی متفرد راوی کی حدیث نہیں لیتے جب تک کہ سلسلہ رواۃ میں اسکا کوئی دوسرا شریک نہ ہو۔ ہاں کبھی کسی راوی پر باوجود تفرد کے جب قوی اعتماد ہو جاتا ہے تو اس کی حدیث لے لیتے ہیں' جیسے یحییٰ بن سعید انصاریؒ

مرداس اسلمی، زاہر بن اسود الاسلمی، عبداللہ بن ثعلبہ، ابوسعید بن المعلیٰ، ابوعقبہ سوید بن نعمان۔ ان چند اسماء کے سوا شاید ہی اور موجود ہوں اور یہ بھی شاذونادر کے حکم میں ہیں۔ اسی طرح امام مسلمؒ نے بھی یہی روش اختیار کی۔

طبقہ ثالثہ میں ایسی جماعت ہے جس نے مثل طبقہ اولیٰ کے امام زہری سے ملازمت تو کی ہے لیکن یہ جماعت مفسدہ جرح سے محفوظ نہیں ہے، اس لئے ان کی بعض حدیثیں قبول کی گئی ہیں اور بعض رد کردی گئی ہیں یہی رواۃ ابوداؤد اور نسائی کے شروط ہیں، مثلاً سفیان بن حسین اسلمی، جعفر بن برقان، عبداللہ بن عمر بن حفص العمری، زمعہ بن صالح المکی، اسحاق بن یحییٰ الکلبی وغیرہ۔

چوتھا طبقہ ایک ایسی جماعت اور قوم کا ہے جو طبقہ ثالثہ کے ساتھ جرح وتعدیل میں شریک ہیں لیکن قلت ممارست کی وجہ سے حدیث زہری میں منفرد ہیں، اس لیے کہ امام زہری کی صحبت انہیں کم نصیب ہوئی ہے یہی شرط امام ابوعیسیٰ ترمذی کی ہے، مثلاً ربیعہ بن صالح، معاویہ بن یحییٰ الصدفی، مثنیٰ بن صباح، اسحٰق بن عبداللہ بن ابی فروۃ المدنی، ابراہیم بن یزید المکی وغیرہ"

اس کے بعد علامہ حازمی فرماتے ہیں کہ "حقیقۃً شرط ترمذی، ابوداؤد کی شرط سے زیادہ بہتر ہے اس لئے جب حدیث ضعیف ہو اور اس کے رواۃ طبقہ رابعہ کے لوگ ہوں اور وہ ان کے ضعف سے مطلع کرنا جائے تو ایسی حالت میں یہ حدیث اس کے نزدیک شواہد اور متابعات کے قبیل سے سمجھی جائے گی، گویا اس امام نے ایک جماعت کی صحت پر اعتماد کیا ہے۔ چنانچہ کتاب ترمذی اسی فن پر مشتمل ہے[1]۔"

میرے نزدیک اصل حقیقت یوں ہے کہ امام ابوداؤد سلیمان بن اشعث سجستانی کا رتبہ امام ترمذی سے بحیثیت مجتہد ہونے کے بلند ہے۔ ترمذی کو رتبۂ اجتہاد حاصل نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امام ابوداؤد سند کے بجائے متن پر زیادہ زور دیتے ہیں۔ سنن ابی داؤد کے دیکھنے سے یہ حقیقت واضح ہوجاتی ہے کہ وہ طرق، اختلاف الفاظ اور

[1] شروط الائمہ

زیادات کو ایک دوسرے سے واضح فرماتے ہیں کیونکہ فقہ حدیث کی جانب امام کی توجہ بہت زیادہ ہے۔ اور اسی خیال سے وہ صحیح سند لاتے ہیں، اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اسنادِ معلل کا سرے سے ذکر تک نہیں کرتے۔ تفصیل کے لئے امام کا وہ خط ملاحظہ کرنا چاہیئے جس کو انہوں نے اہلِ مکہ کے لئے لکھا ہے۔

پانچواں طبقہ ضعفاء اور مجہولین کا گروہ ہے۔ امام ابوداؤد کے نزدیک اس گروہ سے حدیث لینا اس شخص کے لئے جائز نہیں ہے جو ابواب کے تحت احادیث کی تخریج کرتا ہے، الاعلی سبیل الاعتماد والاستشہاد لیکن حضرات شیخینؒ سرے سے اسکے مخالف ہیں۔

اس موقعہ پر ایک بات صاف کر دینی چاہیئے جس میں اہل علم مختلف الرائے ہیں وہ یہ کہ آیا صحیح مسلم میں دوسرے طبقے کی حدیثیں درج ہوئیں یا نہیں؟ حاکم اور امام بیہقی کا خیال ہے کہ امام کی موت نے دوسرے طبقے کی حدیثوں کی تخریج کا موقعہ نہیں دیا۔ لیکن قاضی عیاض کی تحقیق یہ ہے کہ صحیح مسلم میں دونوں طبقے کی حدیثیں موجود ہیں اور اس تحقیق کے لحاظ سے صحیح مسلم میں بجز اُن حدیثوں کے جن کے رواۃ کو عموماً محدثین نے مردود قرار دیا ہے ہر قسم کی روایات درج ہیں۔ عموماً محدثین کے نزدیک جب حدیث متصل الاسناد ہو شروع سے آخر تک ثقہ راویوں کے ذریعہ سے آئی ہو، شذوذ اور علۃ سے خالی ہو تو وہ صحیح تسلیم کی جاتی ہے زیادہ تر اختلاف ان روایتوں میں ہوتا ہے جن میں ایک فریق کے نزدیک صحیح کے تمام شرائط موجود ہوں اور دوسرے کے نزدیک معدوم۔ مثلاً امام بخاری کے نزدیک ابوزبیر مکی، سہیل بن ابی صالح، حماد بن سلمہ وغیرہ میں صحت کے تمام شرائط موجود نہیں اس لیے وہ ان سے روایت نہیں کرتے۔ اس کے بخلاف امام مسلم کے نزدیک قابلِ اعتبار ہیں۔ اسی طرح عکرمہ، عمرو بن مرزوق وغیرہ سے امام بخاری روایت کرتے ہیں لیکن مسلم ان کو قابلِ روایت قرار نہیں دیتے۔ اس بنا پر امام مسلم نے امام بخاری کے چار سو چونتیس رواۃ سے اور امام بخاری نے امام مسلم کے ۶۲۵ راویوں سے روایت نہیں کی۔

اسی طرح مقبول اور معتبر رواۃ میں بھی مراتب کا فرق ہے۔ مثلاً حسن بصری اور ابن سیرین کے

کے دو شاگرد ہیں جو تقویٰ، امانت اور احتیاط میں بہت عالی مرتبہ ہیں یعنی ابن عون اور ایوب سختیانی۔ اور انہیں کے دو شاگرد اور ہیں عوف بن جمیلہ اور اشعث الحمرانی جو معتبر تو ہیں مگر مرتبہ میں ابن عون اور ایوب سختیانی سے کم ہیں۔ اگر کوئی روایت عوف اور اشعث کی ابن عون اور ایوب کے خلاف ہو تو محدثین اس بنا پر اس سے انکار کر دیں گے کہ ان سے زیادہ معتبر لوگوں نے ان کے خلاف روایت کیا ہے۔ یا مثلاً عطاء ابن السائب، یزید بن ابی زیاد اور لیث بن سلیم محدثین کے نزدیک معتبر اور مستند ہیں لیکن ان کا مرتبہ اسمٰعیل بن ابی خالد، سلیمان اعمش اور منصور معتمر کے مثل نہیں ہے لہذا اگر کوئی روایت عطاء، یزید، اور لیث کی ان کے خلاف ہو تو محدثین کے نزدیک مقبول نہ ہوگی۔

دورِ تدوین بہرحال مذکورہ بیان اور فرق مراتب کے سمجھ لینے کے بعد یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہیئے کہ جس طرح امام زہری کے تلامذہ کے طبقات ہیں بعینہ اسی طرح امام نافع اور امام اعمش و قتادہ کے بھی ہیں۔ اس حقیقت کو جان لینے کے بعد بہت سی فنی زحمتیں ختم ہو جاتی ہیں اور طالب حق کے لئے تحقیق و جستجو کی راہیں باز ہو کر تقلید ہی جہالت اُٹھ جاتی ہے۔ اس کا خلاصہ بقول علامہ ابن المدینی یہ ہے کہ سنن و آثار نبوی صلعم کے رکن اعظم جن پر حدیث نبوی کی بنیاد رکھی جاتی ہے چھ حضرات ہیں یعنی امام زہری مدینہ میں۔ عمرو بن دینار مکہ میں۔ قتادہ و یحییٰ بن کثیر بصرہ میں۔ ابو اسحاق اور سلیمان اعمش کوفہ میں۔ پھر ان چھ حضرات کے علم کی فہرست بہت طویل ہے۔ تاہم طبقہ اولیٰ کے مصنفین جنہوں نے سنن و آثار نبوی کو جمع کیا ہے ان کی تاریخی حیثیت دوسری صدی کی ابتدا سے شروع ہو کر چوتھی صدی کے نصف تک قائم رہتی ہے۔ یہی دور حدیث و فقہ کی تدوین اور ان ائمہ کبار کے پیدا ہونے کا دور ہے جن کو عام طور پر لوگوں نے اپنا پیشوا تسلیم کیا ہے علم حدیث کے لیے یہ دور بہترین دور تھا کیونکہ اس دور میں رواۃ حدیث نے اس علم کی تصنیف و تدوین کی ضرورت کو محسوس کیا یعنی یہ کہ ایک ہی قسم کی حدیثوں مثلاً نماز اور روزے وغیرہ کو باہم ایک ہی سلسلہ میں جوڑ دیا جائے یہ خیال تمام اسلامی شہروں میں تقریب قریب ایک ہی زمانہ میں پیدا ہوا یہاں تک کہ یہ نہیں معلوم ہوتا کہ اس کے

تقدم کا شرف کس کو حاصل ہے۔ تاہم اتنا مسلم ہے کہ مدینہ میں امام مالک، مکہ میں عبدالملک بن عبدالعزیز بن جریج اور سفیان بن عیینہ، کوفہ میں سفیان ثوری، بصرہ میں حماد بن سلمہ وسعید بن ابی عروبہ وربیع بن صبیح واسط میں ہشیم بن بشیر، شام میں عبدالرحمٰن اوزاعی ومحمد بن اسحٰق ووکیع بن الجراح، یمن میں معمر بن راشد وعبدالرزاق، خراسان میں عبداللہ بن مبارک، رے میں جریر بن عبدالحمید وغیرہ تھے، اور یہ کچھ اوپر ۱۴۰ھ کا زمانہ تھا۔ ان کتابوں میں جیسا کہ ہم کو موطاء امام مالکؒ میں نظر آتا ہے حدیث نبوی صحابہ وتابعین کے اقوال کے ساتھ مخلوط تھی۔ لیکن ان لوگوں کے بعد دوسری صدی کے آغاز میں دوسرے طبقہ کے لوگوں نے رسول اللہ صلعم کی احادیث کو دوسرے لوگوں کے اقوال سے الگ کرنا مناسب سمجھا اور وہ کتابیں تالیف کیں جو مسانید کے نام سے مشہور ہیں، مثلاً مسند عبداللہ بن موسیٰ کوفی، مسند مسدد بن مسرہد البصری، مسند اسد بن موسیٰ المصری، مسند نعیم بن حماد الخزاعی، مسند اسحٰق بن راہویہ، مسند عثمان بن ابی شیبہ اور مسند امام احمد بن حنبل۔ ان حضرات نے احادیث کو ان کے راویوں کے مسانید میں درج کیا مثلاً مسند ابوبکر صدیق وغیرہ۔

اس طبقہ کے بعد دوسرا طبقہ پیدا ہوا۔ اس نے اپنے سامنے اس عظیم الشان ذخیرے کو دیکھا تو اپنے لیے انتخاب کا دروازہ کھولا اور اس طبقہ کے سرخیل امام بخاری اور امام مسلم ہوئے جنہوں نے روایت وانتخاب میں نہایت چھان بین کے بعد صحیحین کو تصنیف فرمایا۔ انہیں اکابر کی روش دیگر ارباب صحاح نے اختیار کی۔

ایک اصولی تشریح امام زہریؒ سے پہلے سیرت اور حدیث کے عالموں میں کچھ زیادہ فرق نہ تھا البتہ بعض علماء صاحب المغازی کے نام سے مشہور تھے، شاید اس وجہ سے کہ ان کو مغازی کی روایتیں زیادہ معلوم تھیں یا اس وجہ سے کہ مغازی کی روایتیں زیادہ بیان کرتے تھے۔

امام زہری کے وقت میں چار عالم بے نظیر سمجھے جاتے تھے، ابن المسیب مدینہ میں، شعبی کوفہ میں، حسن بصری بصرہ میں اور مکحول شام میں۔ یہ سب ائمہ سیر بھی ہیں اور ائمہ حدیث بھی۔ زہری ان چاروں کے فیض یافتہ تھے۔ چنانچہ امام زہری کے شاگردوں ہی نے سنن اور سیرۃ کو بظاہر دو فنون کی حیثیت سے نمایاں

کیا۔ ایک طرف امام مالک اور سفیان بن عیینہ جیسے ائمۂ حدیث ان کے شاگرد تھے جنہوں نے علم حدیث کی بنیاد کو مستحکم کیا۔ دوسری طرف امام السیر والاخبار محمد بن اسحٰق اور موسیٰ بن عقبہ ان کے شاگرد تھے جن کی روایات اور تصنیفات سے فن سیرۃ ایک مستقل فن بن گیا۔ یہاں پر یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ اصحاب سیر اور ارباب حدیث واقعی دو جماعتیں نہیں ہیں۔ جتنے اصحاب سیر ہیں وہ اصحاب حدیث بھی ہیں اور جتنے اصحاب حدیث ہیں وہ اصحاب سیر بھی۔ مگر سیرت پر جب ان کو واقعات جمع کرنے پڑتے ہیں اور سیرۃ کے مقاصد کو پورا کرنا ہوتا ہے تو اس کے شرائط اور وجوہ ترجیح میں مناسب تبدیلی کرنی پڑتی ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اصحاب حدیث دراصل تین امور کو جمع کرتے ہیں ؛۔

(۱) رسول اللہ صلعم نے کیا فرمایا،

(۲) رسول اللہ صلعم نے کیا کام کیا،

(۳) رسول اللہ صلعم کے سامنے یا آپ کے وقت میں کیا کیا گیا۔

اصحاب سیرۃ بھی انہی تین باتوں کو جمع کرتے ہیں اس لئے اصل کام دونوں کا ایک ہے۔ مگر باوجود اس کے دونوں میں بڑا فرق ہے۔ اصحاب حدیث کا مقصود بالذات احکام کو جاننا ہوتا ہے اور آنحضرت صلعم کی ذات سے ان کی بحث ضمناً یا التزاماً ہوتی ہے۔ اس لئے محدثین کا مدار بحث یہ ہوتا ہے کہ یہ فعل یا یہ قول رسول اللہ صلعم کا ہے یا نہیں؟ ان کی تمام تر قوت اس تحقیق میں صرف ہوتی ہے کہ اس قول یا فعل کا انتساب رسول اللہ کی طرف صحیح ہے یا نہیں۔ لیکن اصحاب سیرۃ کو یہ بھی کرنا پڑتا ہے اور اس کے سوا اس کے ساتھ دو ۲ باتیں اور معلوم کرنی ہوتی ہیں (۱) یہ کہ حضورؐ نے کب ایسا کہا یا کیا، (۲) یہ کہ ایسا کہنے یا کرنے کی وجہ کیا ہوئی۔ اصحاب سیرۃ آنحضرت صلعم کے اقوال و افعال کو مسلسل اور مربوط بنانے کی کوشش کرتے ہیں اور ان کے اسباب و علل کو بھی جاننا چاہتے ہیں۔ اصحاب حدیث کہتے ہیں کہ اس کی ضرورت نہیں ہے جب صحت کے ساتھ یہ معلوم ہو جائے کہ یہ قول و فعل رسول اللہ کا ہے تو وہ رسول اللہ صلعم کی سُنّت اور آپ کا طریقہ ہو گیا۔ گو یہ نہ معلوم

ہو کہ رسول اللہ ﷺ نے کب، کس دن، اور کس تاریخ کو ایسا کہا یا کیا۔ اس فرق کی وجہ سے اصحاب سیرۃ اور اصحاب حدیث کی دو جماعتیں الگ الگ بن گئیں اور معیار تحقیق بھی دونوں کا جدا ہوگیا۔ محدثین رواۃ کی ثقاہت، تقوی اور دیانت کی کمی زیادتی کی بنا پر مقبول رواۃ کی روائیتوں میں اختلاف کے وقت ترجیح دیتے ہیں۔ اور اصحاب سیرۃ حالات کی موافقت اور واقعات کے علم کی بنا پر ترجیح دیتے ہیں۔ بہرحال اصحاب حدیث ہوں یا اصحاب سیرۃ، ان میں سے کوئی بھی جھوٹوں کی روایتیں اور جن راویوں پر جرح شدید ہو ان کے بیانات کو قبول نہیں کرتا۔

ایک اعتراض اور اس کا جواب بیان کیا جاتا ہے کہ بخاری نے اپنی صحیح میں کوئی روایت امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ سے نہیں لی ہے باوجود اس کے کہ امام بخاریؒ، امام ابوحنیفہؒ کے چھوٹے سے چھوٹے اصحاب سے ملے اور ان سے استفادہ کیا۔ اسی طرح امام بخاری نے امام شافعیؒ سے بھی روایت حدیث نہ کی، باوجود اس کے کہ ان کے بعض اصحاب سے امام بخاری کی ملاقات ثابت ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ حضرات محدثین کے تقدس اور تورع، امانت اور کمال دینداری کی بنا پر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ انہوں نے کسی تعصب اور بیجا حمایت سے ایسا کیا ہے۔ جیسا کہ علامہ تاج الدین سبکی طبقات کبریٰ میں فرماتے ہیں:۔

وذکر الشافعی فی موضعین من صحیحہ فی باب فی الرکاز الخمس وفی باب تفسیر العرایا من البیوع ورقم شیخنا المزی فی التہذیب الشافعی بالتعلیق و ذکر ہذین المکانین،	امام بخاری نے اپنی صحیح میں امام شافعی کا ذکر دو جگہ کیا ہے (۱) باب فی الرکاز الخمس (۲) باب تفسیر العرایا (کتاب البیوع) میں اور علامہ مزی نے ان دونوں مقاموں کا ذکر تہذیب میں کیا ہے۔

پھر دفع دخل کے طور پر علامہ سبکی اس سوال کے جواب میں کہ امام شافعی سے روایت کیوں نہیں کی

لکھتے ہیں :-

ولم یرو عن الشافعی فی الصحیح لانہ ادرک اقرانہ والشافعی مات مکتھلا فلا یرویہ نازلاً

یعنی امام بخاریؒ نے کوئی حدیث امام شافعی کے واسطے سے اپنی جامع صحیح میں اس واسطے روایت نہیں کی کہ امام بخاری نے امام شافعی کے اقران کو پایا اور ان کے معاصرین سے اخذ روایت کیا، چونکہ امام شافعی کا انتقال سن کہولت ہی میں ہو گیا تھا اگر امام شافعی کے واسطہ سے روایت کرتے تو حدیث کے سلسلہ سند میں واسطہ بڑھ جاتا اور سند نازل ہو جاتی اس لیے امام شافعیؒ کے واسطے سے بخاری نے کوئی روایت نہیں کی ؟؟

اور امام ابو حنیفہؒ سے روایت نہ کرنے کا سبب یہ بیان کیا جاتا ہے، جیسا کہ علامہ قسطلانی نے شرح بخاری میں لکھا ہے کہ امام بخاری فرمایا کرتے تھے کہ میں نے کسی ایسے شخص سے حدیث نہیں لکھی جس کا یہ قول نہ تھا " الایمان قول وعمل " - مگر یہ بات صحیح نہیں اس لیے کہ خود صحیح بخاری کے سلسلہ اسانید میں ایسے رواۃ موجود ہیں جن کی نسبت " مرجی " لکھا گیا ہے جو اعمال کو جزو ایمان نہیں مانتے تھے - اسی طرح بخاری کے بعض رجال کے متعلق شیعیت اور ایسے ہی دوسرے امور بھی مذکور ہیں جن سے اعتقاداً امام بخاری کو اختلاف ہے لیکن شرائط یعنی عدل، صدق، حافظہ، دیانت وغیرہ موجود ہونے پر کمال بے تعصبی کے ساتھ وہ ان سے روایت کرتے ہیں۔

ہم یہ مانتے ہیں کہ امام بخاری " الایمان قول وعمل " کے باب میں بڑی شدت رکھتے تھے جس کی شہادت صحیح بخاری کی کتاب الایمان سے بھی ملتی ہے - نیز ان کا یہ قول مشہور ہے کہ میں نے ہزار سے زائد شیوخ سے حدیث لی لیکن ایسے شیوخ کے پاس نہیں گیا جو الایمان قول وعمل کے قائل نہ تھے[۱] لیکن یہ بات قابل غور ہے کہ اس قول سے امام بخاری کا تشدد اپنے شیوخ تک ہی محدود رہتا ہے - اوپر کے سلسلہ میں یہ

[۱] مقدمہ فتح الباری وغیرہ

توجیہ سرے سے باطل ہوجاتی ہے۔

دوسرا سبب یہ بیان کیا جاتا ہے کہ ائمۂ کوفہ کا میلان اقوال الرجال سے تخریج مسائل اور تفریع احکام کی طرف کچھ اس طرح بڑھا کہ انہیں خود اپنے ائمہ کی روایت اور ان کی تحقیق پر اعتماد نہیں رہا۔ اس کا ثبوت امام محمدؒ کے اس بیان سے ہوتا ہے:۔

ما اعلم اسوء ثناء علی اصحابه منكم۔ اذا حدثتكم عن مالك ملأتم علی الموضع۔ واذا حدثتكم عن اصحابكم انما تاتون متكارهين [1]

کوفہ والو! تم سے بڑھ کر اپنے شیوخ سے بدظن میں نے کسی کو نہیں پایا۔ جب امام مالک سے حدیث بیان کرتا ہوں تو تم لوگوں سے میرا گھر بھر جاتا ہے۔ اور جب خود تمہارے اپنے ائمہ اور شیوخ سے روایت کرتا ہوں تو تم بکراہت مجلس میں آتے ہو۔

حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے بھی مصفّٰی میں اسی جانب اشارہ کیا ہے:۔

"آں امام ابوحنیفہ یک شخصے است کہ رؤس محدثین مثل احمد و بخاری ومسلم و ترمذی و ابوداؤد و نسائی وابن ماجہ و دارمی از وے در کتابہائے خود روایت نہ کردہ اند و رسم روایت حدیث از وے بطریق ثقات جاری نہ شدہ"

بہر حال جو وجہ بھی ہو میری رائے اس سے مختلف ہے۔ میرے نزدیک حضرات محدثین کا خیال غالباً یہ تھا کہ ان ائمہ کرام ومجتہدین عظام کی حدیثیں تو ضائع اور برباد ہونے سے محفوظ ہیں اس لئے کہ ان کے تلامذہ اور اصحاب چاردانگ عالم میں کثرت سے پھیلے ہوئے ہیں اور ان کے ہاں روایت کے ساتھ ساتھ عمل بھی مشہور ومعروف طریقہ پر جاری ہے۔ اس لئے انہوں نے ان کی احادیث کی طرف توجہ کرنے کی ضرورت نہ سمجھی اور اپنی جدوجہد زیادہ تر اُن رواۃِ حدیث کی جانب مبذول رکھی جن کی روایات کے ضائع ہونے

[1] تہذیب الاسماء واللغات،

کا خطرہ تھا۔ اگر ان کی سعی بلیغ اور مصروفیت دوسری جانب نہ ہوتی تو کوئی وجہ نہ تھی کہ ان ائمہ اسلام کی روایتیں ارباب صحاح کی کتابوں میں نہ ہوتیں۔ کہنے والا کہہ سکتا ہے کہ یہ تو محض محدثین سے حسن ظن اور ان کی حمایت کی بنا پر بات بنالی گئی ہے ورنہ واقعہ یہ ہے کہ محدثین نے گروہ مجتہدین پر عموماً جرحیں کی ہیں، مثلاً امام ثوری نے امام ابوحنیفہ پر اور ابن معین نے امام شافعی پر۔ اور کرابیسی نے امام احمد پر اور ذہلی نے بخاری پر جرح کی۔ بادی النظر میں یہ اعتراض وزنی معلوم ہوتا ہے لیکن اس کا تحقیقی جواب آپ کو آگے ملے گا۔

شرائط رواۃ حدیث و آثار سیاسی اختلافات اور مذہبی تعصبات کی بنا پر جو لوگ اپنے اپنے طریقوں میں غلو رکھتے تھے ان میں سے بہت سے لوگوں نے اپنے عقائد و اعمال کی تائید میں رسول اللہ صلعم سے جھوٹی حدیثوں کی روایت کرنا اپنے لئے جائز کر لیا تھا۔ (امام مسلم نے اپنے مقدمہ میں بالتفصیل اور دوسرے ائمہ نے اجمالاً پوری طرح ان حقائق کو آشکارا کیا ہے) ۔ دوسری صدی ہجری کے آغاز تک شیعہ، خارجی اور چند دوسرے فرقے وجود میں آچکے تھے اور ہر فرقہ میں خبیث الباطن اشخاص پائے جاتے تھے۔ البتہ ان میں سے خوارج نسبتاً کم دروغگو ہوتے تھے کیونکہ ان کے اصول کی رو سے گناہ کبیرہ کا مرتکب کافر ہو جاتا ہے اور رسول اللہ صلعم کی نسبت دروغگوئی کا سب سے بڑا گناہ ہے۔ اس لیے ان میں اس قسم کی جرأت کرنے والے اشخاص مشکل نظر آتے ہیں۔ بہرحال یہ گروہ بندی شروع ہونے کے بعد سے محدثین کا کام بہت زیادہ سخت ہو گیا، اور اس سخت کام کو جس طریقہ سے انہوں نے انجام دیا اس کی روداد پڑھنے سے صحیح اندازہ ہوتا ہے کہ حضرات محدثین نے ان آمیزشوں سے حدیث کو کیونکر پاک کیا۔ اور ان کو اس معاملہ میں کیسی درخشاں کامیابی حاصل ہوئی۔

مذہب اسلام کی اہم خصوصیات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اس کی جملہ تعلیمات کا رابطہ براہ راست صاحب شریعت علیہ السلام سے ہے۔ شریعت کا ہر جزئیہ آفتاب رشد و ہدایت سے ایک زبردست اور ناقابل

انکار نسبت رکھتا ہے۔ تاوقتیکہ کوئی چیز آنحضرتؐ سے ثابت نہ ہو، یا کسی ثابت شدہ چیز سے ماخوذ و مستنبط نہ ہو، وہ شریعت کا جزو نہیں بن سکتی۔ اگرچہ تاریخ اسلام کا کوئی دور ایسے اشرار اور کذابوں سے خالی نہیں رہا جنہوں نے غیر شرعی باتوں کو صاحب شریعت علیہ السلام کی طرف منسوب کر کے اس نظام شرعی کو درہم برہم کرنے کی کوشش کی۔ لیکن اس لحاظ سے بھی تمام مذاہب کے مقابلہ میں اسلام اپنا مثل و نظیر نہیں رکھتا کہ صاحب شریعت کی ہدایات کو بیرونی آمیزشوں سے پاک کرنے اور پاک رکھنے کا جیسا مکمل انتظام اس مذہب میں کیا گیا ویسا کسی دوسرے مذہب کو نصیب نہ ہو سکا۔ اور یہیں پہنچ کر معلوم ہوتا ہے کہ یہ درحقیقت کوئی انسانی کام نہیں ہے بلکہ اپنی آخری شریعت کی حفاظت کے لیے خدا ہی کی طرف سے معجزانہ انتظام کیا گیا ہے۔ ورنہ کوئی شخص بتلائے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے عہد رسالت کے سوا دنیا کے اور کس شخص اور کس دور کے متعلق اتنی تفصیلات انسان محفوظ رکھ سکا ہے؟ اور کس شخص یا دور کے حالات کی حفاظت کے لیے اخبار و آثار کی چھان بین اور صحیح و غلط میں تمیز کرنے کے اس قدر مکمل ذرائع فراہم کئے جا سکے ہیں؟ یہ محض ایک خوش اعتقادی کی بات نہیں ہے بلکہ ایک علمی حقیقت ہے جس کو علمی حیثیت سے ہی جانچنا چاہیے تاکہ نبی آخر الزمان کی تاریخ اور عام انسانی تاریخوں کا فرق پوری طرح واضح ہو جائے، اور ان لوگوں کی غلط فہمی دور ہو جو اس اعجازی تاریخ کو بھی عام تاریخوں کی طرح محض انسانی کارنامہ سمجھ کر ناقابل وثوق ٹھیراتے ہیں۔ ضد اور ہٹ دھرمی کے بجائے خالص علمی طور پر تحقیق کرنے والے کو جس طرح حفاظت قرآن میں خدائی ہاتھ کام کرتا نظر آتا ہے اسی طرح حفاظت آثار نبوی میں بھی نظر آ سکتا ہے بشرطیکہ وہ آرام کرسی پر لیٹ کر تخیلات بارده پر عمارت کھڑی نہ کرے بلکہ تحقیق میں کچھ وقت اور محنت بھی صرف کرنے پر آمادہ ہو۔

اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ آنحضرت صلعم کا قول یا تو بلا واسطہ سنا گیا ہوگا یا بواسطہ رواۃ۔ ظاہر ہے کہ پہلی صورت تو حجت دینی قطعی ہے، اس لیے کہ جب کسی شخص نے خاص ذات نبوی کی زبان سے کوئی

بات سُنی ہو تو وہ مسلمان نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس کی صداقت پر یقین نہ رکھے۔ اب رہ گئی دوسری بات یعنی کسی واسطہ سے آنحضرتؐ کا قول سُننا۔ تو اس کی پھر دو صورتیں ہو سکتی ہیں۔ یا تو وہ اتنے کثیر واسطوں سے سنا گیا ہوگا کہ اتنے کثیر راویوں کا جھوٹ پر متفق ہونا مستبعد ہو۔ یا اس قدر کثیر واسطے نہ ہوں گے پہلی صورت بھی یقینی و قطعی ہے۔ کلام صرف دوسری صورت میں رہ جاتا ہے۔ فقہاءؒ و محدثین کی اصطلاح میں وہ ظنّی سے تعبیر کی جاتی ہے، جس کی عقلی طور پر تین شقیں ہو سکتی ہیں:۔ (۱) وہ جس کی صحت کا ظن غالب ہو (۲) وہ جس کا فساد ظاہر ہو (۳) وہ جس میں احتمال صدق وکذب کی وجہ سے فیصلہ نہ ہو سکتا ہو۔ ان میں سے پہلی قسم کے باب میں بھی اختلاف نہیں ہو سکتا کہ جب کسی خبر کے پہنچنے کے ذرائع معتبر ہوں اور اس کی صحت میں شبہ کرنے کی کوئی معقول وجہ بھی نہ ہو تو اسے قبول کرنا چاہیے۔ اور دوسری قسم میں بھی اختلاف کی گنجائش نہیں کہ جب خبر کا ذریعۂ حصول مخدوش ہو یا اس کا نفس مضمون بداہۃً غلط معلوم ہوتا ہو تو اسے رد کر دینا چاہیئے۔ اب صرف تیسری قسم رہ جاتی ہے اور یہی خبر ہے جس کے باب میں علماء اسلام کے درمیان اختلاف ہے کہ آیا وہ اثبات احکام شرعیہ کے لیے کافی ہے یا نہیں۔

اس تقسیم کی رو سے یہ بات ضروری ہوئی کہ تحقیق اخبار کے لیے ایسے ذرائع اور اصول تلاش کیے جائیں جو نقلی و حسی ہوں تاکہ مخبر کے متعلق فیصلہ کیا جا سکے کہ وہ معتبر ہے یا نہیں؛ اور اس کی خبر پر کہاں تک اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ اس راہ کا پہلا قدم اور سب سے اہم اصول راوی کا مُسلم ہونا ہے۔ اس شرط کے اعتبار سے اہل شرک کی روایت قطعاً مردود ہے، جس پر کتاب و سُنّت و اجماع امت شاہد عدل ہیں۔ دوسری شرط عقل ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ شرط ایسی ہے کہ اسی کی وجہ سے انسان احکامات شرعیہ کا مکلف ہوتا ہے۔ جہاں یہ شیٔ لطیف غائب ہے ساری ذمہ داری ختم۔ دیکھیے مجنون اور بچے کی روایت رفع القلم عن ثلاث الخ کی بنا پر محدثین کے نزدیک حجت نہیں۔ اسی وجہ سے بعضوں نے روایت کرنے کے لیے عمر کی قید لگائی اور ۵ برس تک کے بچے کی روایت قبول کی جیسے محمود بن الربیع۔ پھر اس میں یہ تفصیل کی گئی ہے کہ اگر

تحمل روایت بچپن میں ہوا اور ادا بلوغت میں تو ایسی روایت کے قبول پر سلف کا اجماع و اتفاق ہے[۱]۔ لیکن فقہا محدثین میں نووی و حازمی وغیرہ فرماتے ہیں:۔

قبول اخبار الصبی الممیّز فیما طریقہ المشاهدۃ بخلاف ما طریقہ النقل کالافتاء و روایۃ الاخبار و نحوہ[۲]

با تمیز و سمجھدار بچے کی روایت ایسے واقعات کے متعلق معتبر ہے جو مشاہدہ سے تعلق رکھتے ہوں لیکن جو باتیں نقلیات میں داخل ہیں مثلاً فتوے یا حدیث کی روایت، ان میں بچوں کی روایت مقبول نہیں ہے۔

اس سلسلہ میں یہ بحث بھی پیدا ہو جاتی ہے کہ جس شخص کی عقل کسی امر خارجی کی بنا پر زائل ہو گئی ہو اس نے جو حدیث زوال عقل سے پہلے سنی اور وہ ممتاز بھی ہے تو وہ مقبول ہوگی۔ دوسری صورتوں میں توقف کیا جائیگا قبل اور بعد میں امتیاز کرنا راوی سے معلوم ہوگا۔ خلاصہ یہ کہ اگر کسی طرح سے اس کے علم تک پہنچنا ممکن نہیں تو اس کی روایت کلیتہً رد کر دی جائے گی[۳]۔ تیسری شرط صدق ہے۔ یہ وہ عطیۂ ربانی ہے جس سے حق و باطل میں تمیز ہوتی ہے بلکہ یہ وہ وصف عالی ہے جو انبیاء و اولیاء، ابرار و اخیار کا زیور ہے۔ پس جو اس سے عاری ہے اس کو آنحضرت صلعم کی بات میں یا دوسرے لوگوں کی باتیں میں جھوٹ ملا دینا نہ کوئی عیب نظر آئیگا نہ کوئی خوف دارین۔ لہذا اس کی روایت غیر معتبر ہے۔ چوتھا وصف عدالت ہے یعنی راوی کا عادل ہونا۔ اس لفظ کی لغوی و اصطلاحی تعریف پہلے بیان کی جا چکی ہے۔ تمام اہل علم کا اتفاق ہے کہ کوئی روایت معتبر نہ ہوگی جب تک کہ راوی میں صفت عدل نہ پائی جائے۔ اگر راوی عدل اور ضبط روایت میں کامل ہو جیسے شعبہ و سفیان اور یحییٰ القطان وغیرہ تھے تو اسکی روایت صحیح کہی جائیگی۔ اور اگر دونوں میں یا ایک میں کم ہے لیکن بہرحال عادل اور ضابط ہو تو اس کی روایت درجۂ حسن میں رکھی جائیگی۔ اس فرق کو سمجھ لینے کے بعد بہت سی فنی مشکلات ختم ہو جاتی ہیں بقیہ دوسرا امور جو اس فن کے اندر بیان ہوئے ہیں وہ حقیقتاً انہی عناصر اربعہ کے اجزا ہیں جن میں سے بعض کا ذکر اپنے موقع پر آئیگا (باقی)

---

[۱] ارشاد الفحول وغیرہ [۲] مقدمۃ فتح الملہم [۳] شروط الائمۃ الخمسۃ وغیرہ۔